تحقیق کے اصول وضوابط اور جدید طریقِ کار

پروفیسر صغیر افراہیم

تحقیق نام ہے تلاش وجستجو کا۔ اس میں باریکی اور نظم وضبط کے ساتھ موضوع کا مطالعہ کرنا، منطقی دلائل کے ذریعہ کسی ٹھوس نتیجہ پر پہنچنا اور تعصب وتنگ نظری سے گُریز کرتے ہوئے علمی حقیقت کو تلاش کرنا ہوتا ہے۔

تعلیمی وتدریسی منظر نامہ کو ملحوظ رکھیں تو ماضی قریب میں محض اساتذہ کی ترقیٔ درجات کے لیے یو.جی.سی. کی جانب سے ریفریشر کورس لازمی قرار دیا گیا تھا، مگر اب طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے نصاب میں بھی تحقیق وتدوین کے عنصر کو داخل کردیا گیا ہے۔ اس سے Research Methodology کی ضرورت، اہمیت اور افادیت واضح ہوتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بدلتے ہوئے زمانے کے تحت تحقیق کے جدید ترین طریقِ کار پر زیادہ سے زیادہ توجُہ ہونی چاہیے۔

عالمی سطح پر ہندوستان، تحقیق کے میدان میں کچھ نیا کرنے کے لیے بے چین ہے مگر جو رودادیں شائع ہورہی ہیں وہ تشویش ناک ہیں۔ ان میں پڑوسی ملک چین بھی ہم سے کچھ آگے ہے۔ آخر کیوں؟ حکومتِ ہند اور اُس کے تنظیمی ادارے سائنس اور تکنالوجی کے حصولِ کے لیے بہت فعال ہیں تو پھر کیوں ہمیں قابلِ قدر

کامیابی نہیں مل پا رہی ہے۔ ادب کی صورتِ حال تو اور بھی دگرگوں ہے۔ یہاں بات صرف اردو تحقیق کی کرنی ہے۔ ہمارا دوسرا پڑوسی ملک پاکستان جو تمام معاملات میں پچھڑا ہوا ہے، اِس ضمن میں ہم سے آگے کیوں ہے۔ آخر ان کی کامیابی کی وجہ کیا ہے؟ ہمارے یہاں اعلیٰ تحقیق کے دروازے پر تالے کیوں لگے ہوئے ہیں۔ روایتی اور پُرانی باتوں کو نئے انداز میں پیش کرنے کو ہی تن آساں محقق اپنی سرخروئی کیوں سمجھ رہے ہیں۔ اِن کے اَسباب اور اُن سے پیدا ہونے والے سوالات کی طرف بھی توجہ دلانا مطلوب ہے۔

ا۔ ہمارے یہاں قابلِ فخر اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز ہر ادارے میں موجود ہیں مگر اُن کی تعداد نام نہاد محققین اور اسکالرس کے مقابلے میں کہیں کم ہے۔ ۲۔ پابندیٔ وقت کی عمل آوری اور دلسوزیٔ قلم سے کام کرنے والے دانشور بھی کم ہیں۔ ۳۔ محفل کو زعفران زار بنانے والے اساتذہ کے بارے میں کچھ کہنے سے گھبراتا ہوں۔ اُن طلبہ کی بھی بات نہیں جو موضوع پر دستیاب کتابوں کے متن کو بآسانی جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ بلکہ درخواست اُن کے Supervisors کے حضور میں پیش ہے جو نابغۂ روزگار شخصیات اور اُن کی علمی و ادبی خدمات پر مبنی تحقیق پر فہرستِ تحقیق تشکیل کراتے ہیں، وہ بھی یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ نہیں۔ کاش وہ یہ بھی ہدایت کریں کہ مستند حوالے دیجیے اور نشان زد حصوں میں زیادہ تر اپنا شامل کیجیے۔

قرأت اور طباعت کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو آج اردو کا قاری کم ہوتا جا رہا ہے اور کتابیں زیادہ شائع ہو رہی ہیں۔ اِس حد تک کہ اب کتابوں کو خریدنے کی ضرورت نہیں۔ نگراں صاحبان کی خدمت میں بطورِ نذرانہ اِس حد تک کتابیں آتی ہیں کہ وَرَق گردانی کی بھی فرصت نہیں ہوتی۔ فرمابردار اور دیگر معاملات میں بے حد فعال ریسرچ اسکالرز اپنے نگراں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اُن پر اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنا گوارہ نہیں کرتے کہ کہیں اِس عمل سے حقِ شاگردی مجروح نہ ہو جائے۔

کبھی کبھی تو یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر فکشن پر کام کرنا ہے تو اشخاص یا ادوار کو لے کر کام نپٹانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ بھی قدیم حوالوں سے ۔ جدید موضوعات، افکار ونظریات اور جدید کتابوں سے چشم پوشی اختیار کی جاتی ہے۔ جیبِ خاص سے نئی کتابیں خریدنے کی رسم تقریباً ختم ہو چکی ہے اور تحفتاً بھیجی گئی کتابیں محض دُھول چاٹتی رہتی ہیں۔ کاش وہ طلبہ کو دے دی جائیں اور اُن کے تعلق سے کبھی کبھار دریافت بھی کرلیا جائے یا پھر اُن پر تبصرہ کے لیے کہا جائے، اور اسی کے تعلق سے اصناف، اشخاص، صَنعَت وحرفت پر بات کرلی جائے۔ اُسے کیا اور کیوں لکھنا ہے؟ کو موضوع بحث بناتے ہوئے بتانے کا موقع مل سکتا ہے کہ اگر شاعری موضوع ہے تو صنف کیا ہے؟ غزل، نظم، مرثیہ، مثنوی، رُباعی آخر کیا؟ پھر فکر اور فن، مان لیجیے اقبالؔ موضوع ہے تو فلسفیانہ نقطۂ نگاہ فکر میں شامل ہوگا اور انھوں نے فلسفہ کو کس طرح اشعار میں ڈھال دیا ہے یہ شعریت کے حصہ میں آئے گا۔ اور اس شعریت میں طرزِ بیان اور پیش کش کا انداز خصوصیت کا حامل ہوگا۔ تشبیہات واستعارات اور صنائع وبدائع کس نوعیت کے ہیں۔ مشکل بحریں ہیں کہ آسان۔ ردیف وقوافی کے توسط سے صنفی تقاضے پورے ہوئے ہیں کہ نہیں؟ زبان میں سلاست وفصاحت ہے یا پیچیدگی۔ تذکیر وتانیث کا خیال رکھا گیا ہے یا نہیں۔ لفظوں کی تکرار ہے یا وہ خاص قسم کے ہیں۔

نثر میں بھی زبان وبیان اور فکری اساس کی اپنی شعریت ہے، انفرادی طور پر اب اگر پریم چند پر کام کرنا ہے تو کیا وہی راہ اپنائی جائے گی جس کا تعین نصف صدی پہلے ہو چکا ہے۔ کیا اس جانب توجُہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی جائے گی کہ پریم چند فکشن رائٹر کے علاوہ مُترجم، مُبصِّر بھی تھے۔ انھوں نے درجنوں مضامین اور سینکڑوں اداریے لکھے۔ چشم پوشی اس سے بھی نہیں برتی جاسکتی کہ اردو میں اُن کی پہلی تخلیق کون سی ہے؟ کتنی تخلیقات ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوئی

ہیں؟ ترجمہ خود انھوں نے کیا یا کسی اور نے؟ دونوں ہی صورت میں زبان کی نفاست اور لہجہ کی ادائیگی کا کس حد تک خیال رکھا گیا؟

ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ مصنف کی گفتگو، انٹرویو سے بھی غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً انتقال سے ڈیڑھ سال قبل دیئے گئے ایک انٹرویو میں پریم چند نے اپنی پہلی کہانی کا نام ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' بتایا جسے انھوں نے ۱۹۰۷ء میں دیانرائن نگم کو ماہنامہ 'زمانہ' میں شائع ہونے کے لیے بھیجا تھا۔ معاملات میں سر کھپانے سے گُریز کرنے والوں نے یہ لکھ دیا کہ پریم چند کی پہلی مطبوعہ کہانی ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' ہے۔ ''زمانہ'' کی فائلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلا کہ پریم چند کی وہ کہانی مذکورہ رسالہ میں شائع نہیں ہوئی بلکہ پہلی مطبوعہ کہانی ''عشقِ دُنیا وحُب وطن'' ہے جو ''زمانہ'' کانپور میں اپریل ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت کے دو ماہ بعد پریم چند کا افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' اسی ادارے سے منظر عام پر آیا جس میں ترتیب کے اعتبار سے ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' پہلے نمبر پر موجود ہے۔ مکاتیبِ پریم چند اور دیانرائن نگم کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ پریم چند نے پہلے پہل ''دُنیا کا سب سے انمول رتن'' بھیجی۔ چند دنوں بعد دوسری کہانی ''عشقِ دُنیا وحُبِ وطن'' روانہ کی۔ مُدیر نے دوسری کہانی کو فوری شائع کر دیا۔ اِس درمیان پریم چند کی جو دیگر کہانیاں دستیاب ہوئیں اُن کو نگم صاحب نے مجموعہ کی شکل عطا کر دی۔ پریم چند کے تعلق سے ہی ایک اور مثال ''باکمالوں کے درشن'' سے دی جاسکتی ہے۔ خاکوں کی یہ کتاب پریم چند نے ۱۹۲۹ء میں نویں دسویں جماعت کے نصاب میں شامل کرانے کے لیے تیار کی تھی لیکن ٹیسٹ بُک کمیٹی نے اُس میں ترمیم وتنسیخ کا مشورہ دیا۔ اُس وقت پریم چند بے حد مصروف اور مقروض چل رہے تھے۔ لہٰذا احباب کے مشورے پر ''بہاری'' اور ''کیشو'' پر لکھے گئے مضامین کو ہٹا کر عُجلت میں پانچ مسلم مشاہیر کے خاکے شامل کیے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں ''باکمالوں کے درشن'' کا دوسرا ایڈیشن بھی رام

نرائن بک سیلر، کٹرہ الہ آباد سے شائع ہوا۔ بعد کی تحقیق سے پتا چلا کہ مجموعہ میں شامل پانچ میں سے تین مضامین، اکبر اعظم، وحیدالدین سلیم، اور عبدالحلیم شرر، پریم چند کے نہیں ہیں۔ اکبر، عزیز مرزا کا مضمون ہے جو اکتوبر ۱۹۰۵ء میں 'زمانہ' میں صفحہ نمبر ۱۸۷ تا ۲۰۰ پر شائع ہوا تھا۔ عبدالحلیم شرر، عبدالرؤف عشرت لکھنوی کا مضمون ہے جو فروری ۱۹۲۷ء میں (صفحہ ۱۸۵-۱۹۵) شائع ہوا، اور وحیدالدین سلیم کے مصنف سید عبدالودود درد بریلوی (صفحہ ۹۹-۱۰۵) ہیں۔ یہ اگست ۱۹۲۸ء میں زمانہ، کانپور میں شائع ہوا تھا۔ مزید تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ پریم چند نے اپنے اِس ترمیم شدہ ایڈیشن کے لیے مختصر سے مقدمہ میں وضاحت کر دی تھی مگر نہ جانے کیوں مذکورہ کتاب میں وہ مقدمہ شامل نہیں ہو سکا بلکہ پہلے ہی ایڈیشن کا مقدمہ منسلک رہا۔ اس کوتاہی یا پبلشر کی مصلحت نے پریم چند کے تعلق سے غلط فہمیاں پیدا کر دیں بلکہ آج بھی اس پر طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ تحقیق کا انحصار قیاس، بات چیت پر نہیں، ٹھوس دلائل پر ہوتا ہے جس کے لیے ریسرچ اسکالر کو چھان بین کرنی ہوتی ہے۔ Latest Research Methodology اِس پر زور دیتی ہے۔ کہ اگر ''مکاتیبِ داغؔ'' تحقیق کا موضوع ہے تو الفاظ کی جادوگری، صحتِ زبان، فصاحتِ زبان کا ذکر ضمنی ہوگا۔ روایتی انداز میں یہ نہیں دیکھنا ہوگا کہ داغؔ افکار کے نہیں مُعاملہ بندی کے شاعر ہیں بلکہ اُن کے نثری پیراہن خصوصاً مکاتیب پر تمام توجہ دینی ہوگی۔ اب تک داغؔ کے تین سو خطوط دستیاب ہیں جن میں ۲۸۰ خطوط احسن مارہروی اور ان کے بیٹے رفیق مارہروی نے ''انشاءِ داغ'' اور ''زبانِ داغ'' میں یکجا کر دیئے ہیں، وہ بھی نصف صدی پہلے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ تعداد کے اعتبار سے داغؔ کے سب سے زیادہ شاگرد تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ خط کثرت سے لکھتے تھے تو پھر خطوط کی تعداد اتنی کم کیوں؟ اور ان دستیاب خطوط کی بھی جو درجہ بندی کی جاتی ہے اُن میں والیانِ ریاست، اُمراء، اربابِ نشاط اور شاگردوں پر زیادہ توجُہ

دی جاتی ہے کیوں کہ عزیزوں اور خاص دوستوں کے خطوط بہت کم مل سکے ہیں۔ حالاں کہ احتیاط کے ساتھ پیش کیے گئے واقعات اور دلی کیفیات کا بے باکانہ اظہار اُنھیں میں ہوگا جو آج بھی نجی ملکیت بنے ہوئے ہیں۔ اُن کا حصول بے حد مشکل مگر ناممکن نہیں ہے کیوں کہ اشارے دستیاب خطوط میں ملتے ہیں۔ اِس کے لیے رامپور، حیدرآباد اور کلکتہ کی لائبریری کو خاص طور سے دیکھنا ہوگا، وہ بھی یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ۔ تحقیقِ مزید یعنی Research اِس کی بھی مُتقاضی ہے کہ داغؔ کے ۱۸۶۰ء سے پہلے کے خطوط کہاں ہیں؟ یعنی عمر کی تیس بہاریں گُزرنے کے بعد کے خطوط ملتے ہیں۔ غور کیجیے داغؔ بارہ سال کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ شاہی محل میں داخل ہوتے ہیں اور وہاں تیرہ سال گُزارنے کے بعد پچیس سال کی عمر میں، ۱۸۵۶ء کے تناؤ بھرے ماحول میں قلعہ معلیٰ سے مجبوراً باہر آتے ہیں۔ اور پھر وہ چار سال جو ملک کی تاریخ میں نہایت پُرآشوب کہلاتے ہیں، اُن ایام میں وہ بھی مسلسل دربدری میں گزرتے ہیں۔ چاندنی چوک کے بعد رامپور کا سفر۔ اِس دوران لکھے گئے خطوط نہ صرف نوآبادیاتی نظام کے حوالوں سے اپنے عہد کے عکاس کہلائیں گے، بلکہ ان سے داغؔ کی شخصیت کے بھی کئی گوشے سامنے آسکتے ہیں۔ مدرسۃ العلوم اور ایم.اے.او. کالج کی سرگرمیوں پر بھی روشنی پڑسکتی ہے، تو پھر ریسرچ کے اِس کام کو محض ترتیب وتدوین، حواشی اور مقدمہ تک ہی محدود کرنا کیا مناسب ہے؟

دیکھنے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ اگر کوئی صاحب ساحرؔ لدھیانوی پر کام کررہے ہیں تو اُن کے افسانوں، تبصروں، اداریوں اور مضامین کا نام تو لیا جائے گا کیوں کہ ایسا اُن کے سینئر نے بھی کیا ہے مگر اُن فن پاروں کی نشاندہی پر وقت ضائع نہیں کیا جائے گا۔ کہ وہ کب، کہاں چھپے اور اب کہاں ملیں گے۔ اِسے سہل پسندی کہتے ہوئے تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ قابلِ گرفت بات یہ ہے کہ اگر تحقیقی حصہ شخصیت کی نشوونما سے متعلق ہے تو اُس میں یہ دیکھنا لازم ہے کہ سوانح نگاری سے متعلق مواد

معیاری اور شخصیت سے مطابقت رکھتا ہو۔ اگر مبالغہ آرائی سے گُریز اختیار نہیں کیا گیا تو اس کی کیفیت نثری قصیدے کی سی ہو کر رہ جائے گی اور وہ گوشت پوست کا بشر کم، فوق البشر زیادہ معلوم ہوگا۔ یہ حوالے میں نے اِس لیے دیئے کہ اردو تحقیق میں عموماً جو کام ہو رہے ہیں وہ شخصیات اور اُن کی علمی و ادبی خدمات پر مبنی ہیں۔

اصناف میں قدیم و جدید شاعری، افسانوی اور غیر افسانوی نثر پر توجہ دی جاتی ہے۔ علاقے اور ادوار میں پاکستان، بنگلہ دیش، شمالی ہند، جنوبی ہند، دہلی، لکھنؤ، آزادیٔ ہند سے پہلے یا آزادیٔ ہند کے بعد پر مشتمل موضوعات ہیں۔ اسی طرح تحریکات میں نظمِ جدید، علی گڑھ، سائنٹفک، رومانی، ترقی پسند، جدید، مابعد جدید موضوعات ہوتے ہیں یا پھر کلیات کی ترتیب و تدوین، رسائل کی فرہنگ، توضیحی اشاریے وغیرہ۔ خواتین اور بچوں کا ادب، تراجم اور تقابلی مطالعے پر بھی کام ہو رہے ہیں۔ اور یہ کام سرحد کے اُس پار بھی ہو رہے ہیں اور ہمارے یہاں بھی۔ تو پھر معیار میں اتنا فرق کیوں؟ یہ بھی ایک بڑا سوال ہے۔

سب سے پہلے اس کی وضاحت کرتا چلوں کہ ہمارے یہاں کے اکثر ریسرچ اسکالرز وظائف کے سہارے گُزر بسر کرتے ہوئے ملازمت کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں جب کہ سرحد کے اُس پار کے ریسرچ اسکالرز میں اکثریت اُن حضرات کی ہوتی ہے جو عارضی یا مستقل ملازم ہوتے یا پھر اُنھیں وظائف ملتے رہتے ہیں۔ اِس لیے اُن پر اقتصادی، نفسیاتی دباؤ کم ہوتا ہے۔ وہ عموماً آسودگی کے ماحول میں مقالے قلم بند کرتے ہیں۔ اِس نکتہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیکھیں کہ آج ہمارے یہاں تحقیق کی صورتِ حال غیر اطمینان بخش کیوں ہے جب کہ یو۔جی۔سی۔ تحقیق کے طریقِ کار (Research Methodology) پر مسلسل توجُہ دے رہی ہے تو پھر اُردو کے ریسرچ اِسکالرس اِس سے پورا فائدہ کیوں نہیں اُٹھا پا رہے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ حقائق کی بازیافت، مواد کی تلاش و جستجو میں سر کھپانے کے بجائے وہ

دوسرے کاموں میں زیادہ وقت کیوں صرف کرتے ہیں؟ یہ تشویش طلب معاملہ ہے۔ میری نظر میں اس کے ذمہ دار مقالہ نگار کے ساتھ ساتھ ہم سب اساتذہ، خصوصاً اِس راہِ سنگلاخ کے مسافر بچوں کے نگراں۔ اگر ریسرچ اسکالرز بے حسی کے شکار ہیں تو ہم اپنی اِس مجرمانہ کوتاہی پر شرمندہ کیوں نہیں ہیں بلکہ خوش ہیں کہ ہم نے اپنے سینے کی دولت کسی کو نہیں بخشی اور ہم یگانۂ زمانہ ہیں۔ ممکن ہے پاکستان میں بھی کم وبیش ایسی ہی صورتِ حال ہو مگر تحقیقی نتائج کچھ ہم سے بہتر ہیں۔ میں نے تقابلی مطالعے کے لیے پچھلے پندرہ بیس برسوں کے اہم تحقیقی مقالے اور رسائل سامنے رکھے ہیں۔ یہاں کی صورتِ حال کا ضمنی ذکر ہو چکا، تفصیل سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ چلیے، سرحد کے اُس پار کی بات کرتے ہیں۔

پہلے تحقیقی رسائل: ڈھیر سارے خصوصی شمارے اور رسائل میں مذکور مکالمے کے تعلق سے چار اہم رسالے یہاں موضوعِ بحث ہو سکتے ہیں۔

(۱) ''معیار'': یہ شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد سے نکلتا ہے۔ شمارہ نمبر ایک سے دس[۱۰] تک

(۲) ''تخلیقی ادب'': یہ رسالہ شعبۂ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ نمبر ۳ تا ۱۰ موضوعِ بحث ہیں۔

(۳) ''دریافت'': یہ رسالہ بھی اسلام آباد پاکستان سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ نمبر ۳ تا ۷ دستیاب ہیں۔

(۴) ''تحقیقی زاویے'': شعبۂ اردو، الخیر یونیورسٹی، بھمبر سے شائع ہونے والے اس مجلّے کے پانچ شمارے زیرِ مطالعہ ہیں۔

یہ رسائل وہاں کی تحقیقی، تخلیقی اور تنقیدی صورت حال کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں وہی مضامین شائع ہوتے ہیں جنھیں مجلس مشاورت کے کسی فرد

نے بغور پڑھ کر اپنی رائے دی ہو۔ ایسا نہیں کہ مبصر نے محض تلخیص پڑھ لی ہو جو مضمون کے ساتھ لازم ہے۔ پھر قرب وجوار میں تخلیق ہونے والے ادب پاروں خصوصاً تحقیق پر سخت تبصراتی نوٹ اور خطوط بھی شائع ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ رسائل تخلیق کا واضح نمونہ پیش کرتے ہیں۔ 'معیار' کے شمارہ نمبر-۲۰ میں مُدیر عزیز ابن الحسن کا یہ اقتباس غور طلب ہے:

> ''اُردو تحقیقی جرائد کی ضرورت اور اہمیت محض یہی نہیں ہے کہ اساتذہ کرام اپنے مضامین کی اشاعت کی تعداد پوری کر کے ترقیاں پایا کریں، یہ جرائد صرف اس لیے بھی نہیں کہ ایم ایس / پی ایچ ڈی کے اسکالرز کی درسی و تحقیقی وتنقیدی ضروریات کو پورا کرنے میں ممد ثابت ہوں بلکہ ان کا مقصد ملکی سطح پر بھی تحقیق وتنقید کے معیار کو بلند کرنا ہے۔ ادارہ معیار نے اس پہلو کو ہمیشہ مدِنظر رکھا ہے''۔ (ابتدائیہ: ص ۸)

شاید یہی وجہ ہے کہ وہاں ہونے والی تحقیق میں اصول وضوابط کے ساتھ محنت و ریاضت نظر آتی ہے۔ حالانکہ وہاں بھی تحقیقی کام صد فی صد معیاری نہیں ہے البتہ تناسب کے اعتبار سے ہم سے بہتر ہے جو تقریباً ۶۰ اور ۴۰ کی مناسبت رکھتا ہے۔

آیئے پاکستان کے پچھلے دس سال کے دستیاب تحقیقی مقالوں پر نظر ڈالیں۔ عنوان ہے ''ادیبوں میں خودکُشی کے محرکات'' (اردو ادب کے خصوصی حوالے سے) مقالہ نگار ہیں صفیہ عباد اور نگراں ہیں ڈاکٹر رشید امجد۔ دوسرے کا عنوان ہے ''مکتوباتِ مولوی محمد حسین آزاد کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ'' مقالہ نگار مسرّت یاسمین، نگراں ڈاکٹر گوہر نوشاہی، تیسرا عنوان ہے ''اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات'' مقالہ نگار فوزیہ اسلم، نگراں ڈاکٹر رشید امجد۔ چوتھا عنوان ہے ''اردو ناول میں منظر نگاری'' مقالہ نگار حمید اللہ، نگراں ڈاکٹر نعیم مظہر۔ پانچواں عنوان ہے ''منیر

نیازی کے شعری تصورات کا تنقیدی جائزہ'' مقالہ نگار فرحت جبیں وِرک، نگراں ڈاکٹر رشید امجد، چھٹا عنوان ہے'' آزاد کشمیر میں اردو تحقیق وتنقید کی روایت'' مقالہ نگار محمد جاوید خان، نگراں ڈاکٹر روبینہ شہناز۔ ساتواں عنوان ہے'' جدید اردو نظم کے تناظر میں وزیر آغا کی نظم نگاری'' مقالہ نگار محسن عبّاس، نگراں ڈاکٹر رشید امجد، آٹھواں عنوان ہے'' پاکستانی اردو شاعرات پر بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں کے اثرات'' مقالہ نگار عائشہ حمید، نگراں ڈاکٹر محمد آفتاب احمد، نواں عنوان ہے'' اردو غزل پر بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے اثرات'' مقالہ نگار عابد حسین، نگراں ڈاکٹر رشید امجد، دسواں عنوان ہے'' پاکستان میں دفتری اردو کا تجزیاتی مطالعہ'' مقالہ نگار سید اشفاق حسین بخاری، نگراں ڈاکٹر گوہر نوشاہی، گیارہواں عنوان ہے'' اردو تنقید میں پاکستانی تصورِ قومیت'' مقالہ نگار روبینہ شہناز، نگراں ڈاکٹر رشید امجد، بارہواں عنوان ہے'' پاکستانی ناولوں میں اسلامی فکر کی عکاسی'' مقالہ نگار حافظ نعیم مظہر، نگراں ڈاکٹر آفتاب احمد ثاقب، تیرہواں عنوان ہے'' اردو افسانے پر بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے اثرات'' مقالہ نگار محمد شفیق انجم، نگراں ڈاکٹر رشید امجد، چودھواں عنوان ہے'' پاکستانی انشائیہ نگاروں کے اسالیب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (۱۹۶۰ء تا حال)'' مقالہ نگار سائرہ بتول، نگراں ڈاکٹر روبینہ شہناز، پندرہواں عنوان ہے'' اردو ناول میں سماجی شعور'' مقالہ نگار محمد افضال بٹ، نگراں ڈاکٹر رشید امجد، سولھواں عنوان ہے'' دبستانِ کراچی کے شعری ادب پر سیاسی، سماجی، ثقافتی، اور لسانی اثرات'' مقالہ نگار محمد احمد علی، نگراں پروفیسر ذوالقرنین احمد۔ سترھواں عنوان ہے'' اردو اور پنجابی کے لسانی روابط'' مقالہ نگار عدیلہ رُباب، نگراں پروفیسر سہیلہ فاروقی۔ اٹھارھواں عنوان ہے'' فلسفۂ اخلاق اور سرسید احمد خاں'' مقالہ نگار افشاں عنایت اور نگراں پروفیسر عظمیٰ فرمان۔ آخری عنوان ہے'' انیسویں صدی کی منتخب اردو منظومات ومنثورات کی باہمی تقلیب کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' مقالہ نگار جاوید احمد

خان، نگراں ڈاکٹر عظمیٰ فرمان۔

اِن مقالوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں حرفِ سپاس، ابواب کی تقسیم اور حوالہ جات کے علاوہ مقالے کا دائرۂ کار اور مقاصد کا واضح تعین ہے۔ تحقیقی طریقِ کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے نتائج اور سفارشات بھی ہیں، اور ان دونوں حصوں کی ضخامت بھی مقالے کے تقریباً چوتھائی حصے پر مشتمل ہے۔ دعوے اور دلیل کی زبان منطقی، اسلوب معیاری ہے۔ پروف کی بھی بہت کم غلطیاں نظر آتی ہیں۔ کتابیات میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ مطبوعہ تحقیقی و تنقیدی مضامین، تبصرے، دیباچے، مقدمے، تاثرات ایک جگہ ہوں۔ دوسری جگہ غیر مطبوعہ تحریریں مکمل حوالوں کے ساتھ ہوں۔ ثانوی حصے میں ادبی مجلّات اور تحقیقی سروے کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ سبھی چیزیں واضح اور مدلل نظر آتی ہیں۔

بیرونِ ہند اگر اردو تحقیق پر توجہ دی جا رہی ہے تو ہمیں اس سے سبق لینا چاہیے اور اپنے معیار کو بہت جلد بدلنا چاہیے بلکہ ضرورت اِس بات کی ہے کہ اُن سے بہتر کر کے دکھانا ہوگا۔ اِس کے لیے انتظامیہ، کمیٹی، بورڈ آف اسٹڈیز اور نگراں کو خاص توجہ دینی ہوگی ـــــ ریسرچ اسکالرز کو بھی خلوصِ دل سے کام کرنے کے لیے سب سے پہلے تحقیق کے جدید اصول کو اپنانا ہوگا۔ علمی اور عملی مشکلات کے اِمکانات پر نظر رکھتے ہوئے دائرۂ کار کا تعین کرنا ہوگا۔ کیونکہ تحقیق اور تدوین کے الگ الگ معیار و مسائل ہیں۔ تدوین کے میدان میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ قلمی نسخوں کی بھی درجہ بندی کرنی ہوتی ہے لہٰذا مخطوطہ شناسی کے ساتھ ساتھ عروضی مسائل اور متروک الفاظ کا بھی معاملہ درپیش ہوگا۔ اِسی طرح تحقیق کے لیے بنیادی اور رہنما اصول مرتب کرتے ہوئے پیش آنے والی دشواریوں کے تدارک کے راستے تلاش کرنے ہوں گے۔ مرکزی، ثانوی اور ضمنی حوالوں کی ترتیب و تنظیم میں دلائل کے ساتھ اِستنباط اور اِستخراج کا خیال رکھنا ہوگا۔ مواد کی فراہمی کے لیے تبویب، ضمیمہ، مُلحِقات، انٹر

ویوز، سوال نامے، رُموزِ اوقاف، پیراگراف وغیرہ پر توجہ دیتے ہوئے صحیح نتائج اخذ کرنے ہوں گے، وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ تکرار نہ ہو۔ کیوں کہ احتیاط کے باوجود باریکیوں کی تلاش میں تکرارِ تحقیق کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔ بے داغ تحقیقی اساس ہی تحقیقی تعمیر کا انحصار ہوتا ہے اور اگر آغاز کے وقت ہی جانچ پرکھ میں احتیاط نہ برتی گئی تو اٹلی کے مشہور مینار[1] Tower of Pisa کی طرح تحقیقی کاوش، خود بخود کسی جانب جھکتی چلی جائے گی اور پھر تمام صلاحیتیں اُس کی کجی کو دور کرنے میں صرف ہوتی رہیں گی۔

آخر میں، اُن نکات کی نشاندہی کرنا میرا خوشگوار تنقیدی فریضہ ہے جن کی طرف ہمارے مستند و نامور محققین وقتاً فوقتاً اشارہ کرتے رہے ہیں۔ اور تحقیق کی مسدود راہوں کو آسان بنانے کے لیے مفید مشوروں سے ہمیں سرفراز کرتے رہے ہیں۔ ان میں چند نکات، بطور مثال آپ کے سامنے پیش ہیں، ملاحظہ کیجیے:

۱۔ تن آسانی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک عمدہ طریقہ یہ ہے کہ جن موضوعات پر بآسانی وافر مواد موجود ہو، اور کثرت سے کتابیں دستیاب ہیں، تو تحفظ تحقیق کی خاطر، تکرار لفظ و معنی سے بچنے کے لیے کنارہ کشی کا راستہ اختیار کیا جانا چاہیے

۲۔ اُس موضوع کا انتخاب کریں جس پر کام کرنے کے لیے خاطر خواہ مواد ملتا ہو، اور اسکالر اور نگراں دونوں اس موضوع سے متفق ہوں اور اس کی تحقیقی دنیا میں بھی قدر و قیمت ہو۔

۳۔ روایتی طریقِ کار سے گُریز کرتے ہوئے نئے پہلو اور نئے زاویے تلاش کرنے کے امکانی جتن کریں۔

۴۔ کذا اور تصحیف سے اجتناب برتتے ہوئے اصل متن کا مطالعہ کریں۔

۵۔ چونکہ معیاری تحقیق میں نگراں کا بھی چاق و چوبند رہنا لازمی ہے اس لیے

محترم کو موضوع سے دلچسپی لیتے ہوئے خود بھی نئی تحریروں کو پڑھنا ضروری ہوگا۔

۶۔ ریسرچ اسکالرس اور نگراں دونوں پر پابندیٔ وقت لازم ہے، نیز تحقیقی کام کو پابندی سے جانچنا نگراں کے ذمہ ہوگا۔

۷۔ نگراں حضرات صرف ہدایات سے کام نہ چلائیں، یہ تحقیقی ذمہ داری سے چشم پوشی کہلائے گی۔ نوٹ لگانے اور مسترد کرنے کی بھی عادت ڈالنی ہوگی۔ اور نمونتاً مثالیں پیش کرنی ہوں گی۔

۸۔ دوستی اور دلنوازی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، دیانت دارانہ رائے دینی ہوگی۔

یہاں معروف محقق کارترے کے اصولِ تدوین کا ذکر کرنا، دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا جو ہماری توجہ ناقلین متن کی جانب مبذول کراتا ہے۔ کارترے تدوین متون کے کئی تجربوں کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اگر مدون، اصل نسخے تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے اور اس کا تحقیقی کام نقل شدہ مسودہ کو محیط ہے تو اِس اصول تدوین متن کو دل و دماغ میں محفوظ کر لیجیے کہ ہر ناقل مسودہ نقل کرنے کے درمیان تین فیصد غلطی کرتا ہے۔ یعنی جتنے ناقل اتنی تین فیصد غلطی۔ یہ غلطی جلد بازی، سہواً یا لاشعوری طور پر ممکن ہے لیکن عمداً بطور اصلاح غلطی کرنا، ناقابل قبول ہے۔ مثلاً غالبؔ نے اپنے ایک خط میں دلجمعی کے بجائے دلجمی لکھا ہے۔ مدون نے دلجمی کی اصلاح کرتے ہوئے قصداً دلجمعی لکھ دیا، جب کہ غالبؔ مزاحاً ''دل جمنا'' یعنی دل کا جمنا لکھنا چاہ رہے تھے۔ (ماخذ: غالب کی تحریر کے بارے میں ایک نیا گوشہ: خطوط غالب، مرتبہ: خلیق انجم کی روشنی میں کمال احمد صدیقی، مشمولہ سہ ماہی اردو ادب شمارہ:۴۱۔۲۴۰، جلد:۶۱۔۶۰) باوجود ان مسائل کے میرا معروضہ یہ ہے کہ تحقیق وتدوین کا کام مشکل نہیں ہے اور نہ ہی کچھ ناممکن ہے۔ بس، آسانی طبع کے روایتی

انداز سے اجتناب کرنا ہوگا۔اور محنت شاقہ کی عادت سے روبرو ہونا ہوگا۔اِس لائحہ عمل کے نتائج کے طور پر جب اردو کے بہی خواہ معتبر اور مستند جرائد میں فخریہ جملوں کے ساتھ ریسرچ اسکالرز کے مقالوں کو عالمی تناظر میں دیکھیں گے تو بلاشبہ اُنھیں دلی مسرت ہوگی، ایسے میں خوشی کے لمحات تحقیق کے معیار کے بھی ضامن ہوں گے۔

حواشی:

۱؎ ۱۱۷۳ء میں عیسائیوں کے تقدس کے پیش نظر اِس مینار کی تعمیر شروع ہوئی۔ ہر چہار جانب سے اِس کی یکسانیت کو برقرار رکھتے ہوئے تین منزلیں مکمل ہوئیں تو معلوم ہوا کہ مینار ایک طرف کو جُھک رہی ہے۔ اِس کا سبب جھکاؤ والے حصہ کی طرف کی مٹی میں وہ پختگی نہیں تھی جو دوسرے اطراف میں تھی لہٰذا مقدس مینار کی آٹھ منزلیں مکمل ہونے میں دوسو سال لگ گئے۔ عالمی شہرت یافتہ 'پیسا ٹاور' آج بھی تقریباً چھ میٹر جھکی ہوئی نظر آتی ہے اور دیدار کرنے والے یہ کہہ کر مطمئن ہوجاتے ہیں کہ ہے کجی عیب مگر Tower of Pisa کا یہی حُسنِ سحر اور انفرادیت ہے۔

☆☆☆